تدوینِ فقہ

(۷)

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات
جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

بہرحال جس طریقہ سے بھی دیکھا جائے مشاہدہ اور تجربہ کی راہ سے ہو یا قرآن وحدیث کی روشنی میں ہو، ہر حال میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ افرادِ انسانی کا اختلاف مصنوعی نہیں بلکہ قدرتی ہے، بنانے والے نے آدمی کی ساخت ہی ایسی رکھی ہے کہ باہم ان کا مختلف ہو جانا ناگزیر تھا، اس کے ازالہ کا خیال قدرت سے مقابلہ کا خیال ہے۔ البتہ اس قسم کے جبلی صفات کے مفاسد کے روکنے کی کارگر تدبیر ہمیشہ سے یہی رہی ہے کہ ازالہ نہیں بلکہ امالہ کر کے بجائے نقصان کے ان سے نفع اٹھالیا جائے اور اسلام نے یہی کیا بھی ہے، اس نے دین کے ایک حصہ کو تو شیوع عام اور استفاضہ کی راہ سے لوگوں میں اس طرح پھیلا دیا کہ خود شریعت کے العیاذ باللہ غلط یا صحیح ہونے کا احتمال تو ان قلوب میں پیدا ہو سکتا ہے جو اب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان نہیں لائے ہیں۔

لیکن یہ بات کہ جس حصہ کو یہ کیفیت عطا کی گئی ہے وہ اسی دین کے اجزاء ہیں جس کی تبلیغ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اس کا انکار آدمی کے بس سے باہر ہے، مثلاً خود قرآن کا جو چیزیں اسلام کی اسی راہ سے پہنچی ہیں جس راہ سے قرآن پہنچا ہے ان کا جو حال ہے، قرآن میں اسی کا نام "البینات" رکھا گیا ہے، یعنی ان کا دین کے عناصر و اجزاء میں ہونا ایک ایسی کھلی بین حقیقت ہے جس کا انکار عقل و فطرت کے حدود سے خارج ہے، ان ہی "البینات" پر متفق و متحد کر کے مسلمانوں کے اختلافی پہلو کا امالہ ان امور کی طرف کر دیا گیا، جن کی حیثیت دین میں "البینات" کی نہیں ہے

یعنی "البینات" میں متفق و متحد ہو کر اگر غیر بیناتی مسائل میں اختلاف بھی پیدا ہو جائے تو اس اختلاف کو ایسا اختلاف نہیں قرار دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ایک ٹولی کا دین دوسری ٹولی کے دین سے یا ایک فرقہ کا مذہب دوسرے فرقہ کے مذہب سے جدا ہو جاتا ہے، اور یہی وہ بات تھی کہ ابتدا ہی سے یعنی عہد صحابہ ہی سے مسلمان ان امور میں مختلف ہوتے رہے، لیکن نہ اس اختلاف کو انہوں نے چنداں اہمیت دی، اور یہ تو کبھی ہوا ہی نہیں کہ محض اس اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں کے کسی گروہ کو دوسرے طبقہ سے جدا کیا گیا ہو، بلکہ اس اختلاف میں افادے کے نت نئے پہلو مختلف زمانوں میں مسلمان جو پیدا کرتے رہے، ان کی ایک حد تک تفصیل سنائی جا چکی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ گذشتہ تیرہ صدیوں میں مختلف اقالیم و امصار میں جن بزرگوں کے جن خداداد کمالات کا ظہور اسلام کے مختلف شعبوں میں ہوتا رہا، اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو بروئے کار لانے میں ان اختلافات کا بھی حصہ ہے، ان ہی کی تحقیق و تفتیش تنقید و تنقیح اور ان میں تطبیق و توفیق و ترجیح کی کوششوں ہی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی امامت و پیشوائی کے جلیل منصبوں پر وہ سرفراز ہوئے اور اپنی محنتوں، جانکاہیوں کا جو صلہ اس دن ان کے سامنے جب آئے گا جس دن ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا ہو گا، آج اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے، سورۂ ہود کی مذکورہ بالا آیت کے متعلق بعض ارباب نظر کی نظر جو یہاں پہنچی ہے جسے قاضی بیضاوی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

او الیہ والی الرحمۃ　　　یعنی ذالک کے اسم اشارہ کا اشارہ اختلاف کی طرف بھی ہو، اور رحمت کی طرف بھی ہو۔
(ج ۱ ص ۳۸۹ مطبوعہ ہند)

تو جہاں تک واقعہ ہے اس سے تو اسی کی تائید ہوتی ہے، مطلب یہ ہے کہ میلانات و رجحانات کے فطری اختلاف کے رخ کو "البینات" سے ہٹا کر جن لوگوں نے دین کے "غیر بیناتی" حصہ کی تحقیق و ریسرچ کی طرف پھیر دیا، ظاہر ہے کہ اپنے اجتہاد و کوشش کے صلہ سے وہ محروم نہیں ہو سکتے اور محروم کیا معنی خدا کی رحمتوں اور کرامتوں کے وہ مستحق نہ ہوں گے تو اور کون ہو گا،

پس کھلی ہوئی بات ہے کہ یہی اختلاف ان کے حق میں ذریعۂ رحمت بن گیا، اور یوں ذلک کے اسم اشارہ کا اشارہ "اختلاف اور رحمت" دونوں طرف صحیح ہو جاتا ہے۔

بلکہ کل ان کے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے اس کا ثبوت آج ہی اس سے مل رہا ہے، کہ کروڑہا کروڑ مسلمانوں کے قلوب نسلاً بعد نسل ان بزرگوں کے تشکر و امتنان کے جذبات سے لبریز ہیں اتنے لبریز کہ "رحمۃ اللہ علیہم" "رضی اللہ تعالیٰ عنہم" کی دعاؤں کے بغیر ان کا تذکرہ نہیں کر سکتے، آخر کوئی بات ہی تو ہے کہ مکتب خانوں کے میاں جی بیچارے بھی تو بچوں کو قرآن ہی پڑھاتے ہیں، خدا کی باتیں ہی سکھاتے ہیں، مگر اعزاز و احترام کا وہ حصان کو کہیں نہیں دیا جاتا جو صرف ان بزرگوں کے ساتھ مخصوص ہے جنھوں نے خلافیاتی مسائل کے سلجھانے کی کوششوں میں اپنی جانیں لڑا دی ہیں۔

یہی وہ وجوہ و اسباب ہیں جن کی بنیاد پر سمجھا جاتا ہے کہ انسانی افراد کے باہمی اختلافات کے ازالہ کی کوشش دنیا کے جن مکاتبِ خیال میں چاہا جاتا ہے، خواہ اس کا تعلق دین سے یا دنیا سے یا زندگی کے کسی شعبہ سے ہو یہ ایک لاحاصل کوشش اور بے معنی سعی ہے بلکہ یہ نصب العین خود اس نصب العین کی غلط اور باطل ہونے کی دلیل ہے [1]

ضرورت جو کچھ بھی ہے وہ ازالہ کی نہیں، بلکہ صرف امالہ کی ہے اور یہی تدبیر اسلام نے اختیار کی، مسلمان ابتدا سے اسی پر عمل پیرا رہے۔

---

[1] مجھے تو اس پر حیرت ہوتی ہے کہ انسانوں میں کوئی اونچا کیوں ہو اور نیچا کیوں ہو، اس سوال کے اٹھانے والے اس کے سوا اور کیا چاہتے ہیں کہ دنیا جو کچھ مان رہی ہے اس کو چھوڑ کر ان کی ماننے لگے، ان کو اپنا امام بنا لے، اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلے۔ کیا خود یہ نظارہ اسی کا نہیں ہے کہ سب کو نیچا کر کے ایک ان میں اونچا بن رہا ہے یا بننا چاہتا ہے۔ آخر جاہ کی راہوں میں یہ نشیب و فراز بہر حال جب باقی ہی رہے گا تو بالفرض اگر مال کی حد تک ہمواری پیدا کرنے میں کامیابی بھی ہو جائے تو اس کا کیا حاصل، ضرورت کی حد تک مال کی طلب کا پیمانہ ہی کیا ہے۔ ضرورت تو اس کی بھی پوری ہوتی ہے جو غریب مہینہ میں دس پانچ سے زیادہ کما نہیں سکتا۔ معاشی تگ و دو کی ساری گرم بازاری کے پیچھے غور کرنے والے جانتے ہیں کہ زیادہ تر آبرو و جاہ ہی کا جذبہ چھپا ہوا ہے، اور اگر جاہ طلبی کا دروازہ بھی بند کر دیا گیا تو دنیا میں ہو یا آخرت میں افراد کے فطری کمالات کے ظہور کا ذریعہ ہی کیا رہ جائے گا۔

لیکن اچانک مسلمانوں کو کچھ دنوں سے دیکھا جارہا ہے کہ "مذہبی اختلاف" جس میں گوناگوں مصالح و منافع کی ضمانتیں پوشیدہ تھیں، ایک ایسا لفظ بن گیا ہے کہ زبان سے ادھر نکلا نہیں اور پیشانیاں چڑھ گئیں، حقارت و نفرت کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوجاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شدید ترین جرم ہے جس کے مسلمان مرتکب ہیں، ان پر تو زبانیں بہ ظاہر نہیں کھلتیں، جن پر زبان کھولنے کا نتیجہ اگر اپنے خون سے نہیں تو کم از کم اپنی عزت و آبرو سے کھیلنا بن جاتا ہے، لیکن لعنت کی کوئی قسم اور ملامت کا کوئی طریقہ باقی نہیں چھوڑا جاتا جو عام مسلمانوں پر مذبر سائے جاتے ہوں، وہ دھتکارے جاتے ہیں، دردرائے جاتے ہیں، اسی قصور میں کہ مذہبی "اختلافات" کے قصوں کے مٹانے میں وہ ابتک کامیاب نہیں ہوسکے، ذمہ داری اسی کی تھوپی جاتی ہے مذہبی پیشواؤں کے سر اور دھجیاں اس کے بعد بکھیری جاتی ہیں ان غریبوں کے جبہ و دستار کی۔

یہ حال ہے جس میں کسی ایک ملک ہی کے مسلمان مبتلا نہیں ہیں بلکہ تقریباً آج جہاں کہیں ایسے مقامات میں مسلمان آباد ہیں جہاں کسی نہ کسی بھیس میں مغربی تہذیب تمدن کے تھپیڑے پہنچ سکے ہیں، سب کی یہی کیفیت ہے؟

وقت آگیا ہے کہ کچھ اس کے متعلق بھی عرض ہی کردیا جائے، طوالت تو ہوہی چکی، لیکن جس لئے طوالت کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، ڈر ہے اگر یوں ہی خاموشی اختیار کی گئی، جیسے اب تک کی جارہی ہے تو اس کا طول و عرض حد سے زیادہ نہ متجاوز ہوجائے، میں نے کسی موقعہ پر اشارہ کیا تھا کہ مسلمانوں کے حال کو ان کے ماضی سے بے تعلق کرکے جب تک توڑا نہیں گیا تھا اس وقت تک ان "مذہبی اختلافات" کی ضرر رسانی کے لحاظ سے کوئی اہمیت نہ تھی، بلکہ بالعکس اس کے ہمیشہ ہر دور میں بزرگوں نے اس کے افادی پہلوؤں ہی کو مسلمانوں پر واضح کرنے کی کوشش کی۔ دراصل ان اختلافات کی تاریخ کا یہی وہ ماضی تھا جس سے بتدریج مسلمانوں کو جدا کیا جارہا ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اپنے ماضی سے توڑنے پر بس نہیں کیا گیا، بلکہ کچھ ایسے حالات پیدا ہوتے جارہے ہیں یا قصداً کئے جارہے ہیں جن کی بدولت اپنوں سے ٹوٹ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر مسلمان اپنے حال کو

ن قوموں کے ماضی سے جوڑ رہے ہیں جن کا ماضی مسلمانوں کے ماضی سے مختلف بلکہ کہا جاسکتا
ہے کہ بالکلیہ مختلف ہے، لیکن مغالطہ یہ ہو رہا ہے، یا دیا جا رہا ہے کہ وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی
نسان ہیں۔ پس انسانوں کی تاریخ ماضی کا مطالعہ انسانوں ہی کے حال کی تصحیح کے لئے اگر کیا جائے
واس کے سوا فطری قاعدہ اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔

لیکن میں اس کو مغالطہ اور بدترین قسم کا مغالطہ یقین کرتا ہوں، تفصیل کے لئے تو شاید
یک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کا خلاصہ شاید یہ ہو سکتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مذہبی اختلافات کے باب میں مسلمانوں کی اگلی نسلوں کے جو احساسات
تھے، غالباً اس کا ایک معتدبہ اور کافی حصہ آپ سُن چکے، اب ذرا آئیے، جن قوموں کی ماضی کا اپنے
ی جیسے انسان باور کرا کے اپنے حال کی تصحیح کے لئے ہم سے مطالعہ کرایا جا رہا ہے، یا ہم آج ان کا
طالعہ کر رہے ہیں، واقعۃً ان کے ماضی کی صحیح اور سچی داستان مذہبی اختلافات کے مسئلہ میں کیا ہے،
یں صرف اشارے کروں گا۔ کیونکہ واقعات سے کم و بیش لوگ آگاہ ہیں، البتہ ان کے متعلق جس
قطۂ نظر کو اس تقابلی مطالعہ کے سلسلہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں، عموماً اس سے غفلت برتی جاتی ہے
س لئے میرا یہ بیان تفصیل کی نہیں صرف تنبیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اتنا تو سب ہی جانتے ہیں کہ مذہب کے متعلق آج یورپ کے احساسات کچھ ہی ہوں لیکن
یادہ دن نہیں گذرے ہیں، صدی دو صدی سے بھی شاید کم ہی مدت کہ یورپ ایک مذہبی اور
عالی قسم کا مذہبی ملک تھا۔ مختلف عوامل و موثرات، اسباب و وجوہ کے تحت آج سے سینکڑوں
سال بلکہ ہزار ڈیڑھ ہزار سال بھی اگر کہا جائے تو یہ غلط نہ ہوگا کہ مذہب نے اس ملک میں اپنا ایک
عجیب و غریب نظام قائم کر لیا تھا، وہی نظام جس کی عام تعبیر لفظ "کلیسا" سے کی جاتی ہے۔

یہ کلیسا اور اس کا قائم کیا ہوا نظام کیا تھا؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ ہزار ڈیڑھ ہزار سال کی
تاریخ ہے۔ لیکن اتنا تو سب ہی جانتے ہیں کہ یہ ایک بے پناہ طاقت اور قوت تھی، جو مذہب کے نام

مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا، غریب ہو یا امیر، حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے راجواڑوں سے لیکر بڑے بڑے صاحبانِ تخت و تاج با شوکت و جبروت سلاطین بھی طاقت و قوت کے اس آہنی شکنجے میں کچھ اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ کلیسا کی مرضی کے خلاف ہل بھی نہیں سکتے تھے، یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے جس دور کا نام یورپ کی تاریخ میں "قرونِ متوسط" رکھا گیا ہے، اور آج ان قرونِ متوسط کو ریسرچ کے زور سے مسلمانوں کی تاریخ میں بھی ڈھونڈھا جا رہا ہے۔ چاہا جا رہا ہے مسلمانوں کے گذرے ہوئے قرون میں بھی کچھ ایسے قرون پیدا کئے جائیں جن کا نام بھی وہی ہو کے "قرونِ متوسط" کا نام ہو، اور ثابت کر دیا جائے کہ ان کے کام بھی وہی تھے جو یورپ نے "قرونِ متوسط" میں انجام دیئے گئے۔

خیر یہ تو الگ بات ہے کہ مسلمانوں پر بھی کچھ ایسے قرون گذرے ہیں یا نہیں، جنھیں وہ میں لفظاً و معناً یورپ کے قرونِ متوسطہ کا ہمدوش و ہم زلف قرار دیا جا سکتا ہو، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یورپ اپنے قرونِ متوسط کے متعلق کلیسا کی بے پناہ قوتوں اور طاقتوں، عنان گیر اقتدارات و اختیارات کی جو داستان بیان کرتا ہے یقیناً وہ وہی ہے جو وہ بیان کرتا ہے۔

کہہ چکا ہوں کہ تفصیلات کا نہ تو یہاں موقعہ ہے اور نہ ان کی ضرورت ہے۔ صرف موٹی موٹی چند مشہور چیزوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جو سامنے آتی ہے وہ "Isidoran Decretalis" نام کا وہ مجموعہ ہے جسے آج یورپ اپنی تحقیقاتی روشنی میں خواہ کچھ ہی قرار دیتا ہو، لیکن جب ۸۶۰ء میں رومۃ الکبریٰ سے وہ شائع کیا گیا اور تقریباً ہزار بارہ سو سال تک بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ تک مقدس صحیفہ کی حیثیت سے کلیسا کے خزانہ میں وہ محفوظ رہا، سب جانتے ہیں کہ اس کی نوعیت ان لاریبی وثائق و مستندات کی تھی جن کے کسی ایک فقرہ پر شک کا اظہار ارتداد، اور دینِ مسیحی سے خارج ہونے کے لئے کافی تھا۔ اے۔ جی۔ گرانٹ صاحب اپنی کتاب تاریخ یورپ میں ان مندرجات کا جو اس مجموعہ میں تھے یہ خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

"یورپ کو کلیسا کے معاملات میں بلا شرکت غیرے کامل اختیارات حاصل ہیں، اور مغربی ممالک (یورپ) پر حکمرانی کا حق بھی اسی کو حاصل ہے۔" [۱]

اس مجموعہ کے نہ براہِ راست دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے نہ ان کے تراجم تک میری رسائی ہے لیکن جن تحریروں کے کسی مجموعہ کا یہ خلاصہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں کیا کچھ نہ ہوگا۔

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ وہ شاہی وثیقہ ہے جو سب سے پہلے عیسائی مذہب کے قبول کرنے والے بادشاہ "قسطنطین" کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ کلیسا کے نام تعمیل کیا گیا۔ گرانٹ صاحب نے جس کا نام "عطیہ کانس ٹن ٹائن" بتایا ہے اور وہی راوی ہیں کہ اس عجیب وغریب نوشتہ میں یہ بیان کیا گیا ہے۔

"شہنشاہ کانس ٹن ٹائن وفادار، رحمدل، قادر و نیک منش، شاہ اقوام المانی و سرمانی و جرمانی، و برطانی، و ہونی، پارسا، و خوش نصیب فاتح و غازی و ذی شان، مرض جذام میں مبتلا تھا اور بت پرست پجاریوں نے اس کو مشورہ دیا تھا کہ معصوم بچوں کے خون میں نہلائے بغیر اسے صحت نہیں ہو سکتی۔ مگر سینٹ پال اور سینٹ پیٹر کی دعاؤں سے اسے صحت حاصل ہوئی اور صحت یابی کے شکریے میں اس نے حکم دیا کہ کلیسا روما کا قسیس اعلیٰ تمام دنیا کے قسیسوں کا سردار ہوگا، اور پوپ سلوسٹر ہمارے محلات واقع روما، اور خود شہر روما، اور اطالیہ کے تمام اضلاع اور صوبوں اور ممالک غرب (یورپ) پر قابض رہیگا۔"

اور آخر میں لکھا ہوا تھا کہ

"ان احکام میں ختم عالم تک کسی قسم کی ترمیم یا تغیر نہ کیا جائے۔" [۲]

جیسا کہ گرانٹ صاحب نے خود ہی لکھا ہے کہ پہلا مجموعہ بھی

"زمانہ حال کے تحقیقات سے یہ ظاہر ہے کہ یہ سب تحریریں جعلی تھیں۔" [۳]

---

۱ تاریخ یورپ گرانٹ، مترجمہ دار الترجمہ سرکار عالی ص ۳۵۱ ۔ ۲ ایضاً ص ۲۵۲ ۔ ۳ ایضاً ص ۲۵۱

اسی طرح "کانسٹن ٹائن کا عطیہ" والے وثیقہ شاہی کے متعلق بھی وہی لکھتے ہیں کہ

"پندرہویں صدی تک جب تک کہ یورپ میں پھر علوم و فنون کا دور دورہ نہ ہوا، کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس تحریر کو جعلی قرار دے یا اس کی صحت میں شک لائے" (۲۵۲)

اور اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں پر اقتدار کے پنجوں کو مضبوط کرنے کے لئے یہ جعلی تحریریں وقتاً فوقتاً بنائی جاتی تھیں، ان بھولے بھالے مسکینوں پر ان کا کیا اثر مرتب ہو سکتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بتدریج پوپوں کی قوت اپنی جڑیں جماتی چلی جاتی تھی تا آنکہ گیارہویں صدی عیسوی کے مشہور پوپ گری گوری ہفتم کے زمانہ میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اس عہد کی ایک تحریر کا ترجمہ گرانٹ صاحب نے ان الفاظ میں دیا ہے:۔

"پاپائے روما کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں، اسی کو بشپوں کے عزل و نصب کا اختیار ہے، اس کے افعال پر حرف گیری کرنے والا کوئی نہیں، کلیسہ روما کو نہ کبھی دھوکہ ہوا ہے اور نہ ہوگا، پوپ کو شہنشاہوں کے معزول کرنے کا اختیار ہے۔ انسانی نخوت نے بادشاہوں کی قوت پیدا کی ہے، اور خدا کے رحم نے بشپوں کی قوت پیدا کی ہے۔ پوپ شہنشاہوں کا آقا ہے۔" (ص ۲۶۸)

گرانٹ صاحب نے لکھا ہے اور سچ لکھا ہے کہ اسی قسم کی تحریروں کا اثر تھا کہ پوپ

"کلیسہ کو دنیا کی اعلیٰ ترین قوت خیال کرتے جسے اقتدار ذات باری تعالیٰ سے براہ راست عطا ہوا تھا اور جس کے بادشاہ اور شاہزادے دست نگر تھے۔" (ص ۲۶۸)

نہ صرف پوپ ہی کا وجود ہر قسم کی حرف گیریوں سے آزاد تھا بلکہ جن بشپوں اور پادریوں کو خدا کے رحم نے پیدا کیا تھا، ان کے متعلق بھی پوپ کا دعویٰ تھا کہ

"سلطنت کی عدالتوں کو پادریوں کے مقدمات سماعت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے" (ص ۳۳۶)

گرانٹ صاحب نے ۱۰۷۵ء میں گری گوری ہفتم کی اس پاپائی گشتی کا ترجمہ ایک موقعہ پر یہ درج کیا ہے۔

"دنیاوی حکام خواہ شہنشاہ ہوں یا بادشاہ وغیرہ وہ ہرگز مجاز نہیں ہیں کہ عہدہ داران کلیسا کا تقرر عمل میں لائیں اور عصا اور انگشتری سے اس کو سرفراز کریں۔"

آگے لکھا:-

"اگر کوئی شہنشاہ یا بادشاہ یا ڈیوک وغیرہ مذہبی خدمات کے تقررات میں دخل دینے کی جرأت کرے گا تو وہ کافر و مرتد ہے" (ص ۲۰۰)

کفر وارتداد کے اس پاپائی فتوی کے بعد پادریوں کے اقتدار کا جو حال ہو سکتا ہے ظاہر ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ یورپ تو یورپ تمام دنیا کے مسیحی ممالک کے لئے ان کی تعمیل واجب وفرض سمجھی جاتی تھی، گرانٹ نے شاہ فریڈرک کے حالات میں ایک موقعہ پر لکھا ہے کہ پوپ نے شہنشاہ کو کلیسا سے خارج کر دیا تھا اور یہ کم سے کم سزا تھی جو کسی بادشاہ کو پاپائی آستانہ سے بہ نظر ترحمانہ دی جاتی تھی، اثر صرف اس قدر رہتا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں جو صلیبی لڑائیاں یورپ پوپ کی فتوی نمائیوں کی روشنی میں لڑ رہا تھا، اس جنگ میں "کلیسا بدر" بادشاہوں کو شرکت کا استحقاق باقی نہ رہتا تھا۔ بہرحال فریڈرک کو بھی سزا دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا' جیسا کہ گرانٹ ہی نے لکھا ہے۔

"جب وہ (فریڈرک) وہاں (یروشلم) پہنچا تو اسے کوئی پادری ایسا نہ ملا، جو تاج اس کے سر پر رکھتا (یہ ایک رسم تھی جو بادشاہوں کے لئے پادری ادا کرتے تھے) کیونکہ وہ کلیسا سے خارج ہو چکا تھا اس لئے اس نے قربانگاہ سے تاج اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے اپنے سر پر رکھ لیا" (ص ۲۹۸)

یہ چند سرسری اور عام باتیں ہیں، جن سے یورپ کی تاریخ کا شاید کوئی معمولی طالب علم بھی ناواقف نہ ہوگا، آپ ان حقائق کو اپنے سامنے رکھئے جن کا حاصل صرف یہ ہے کہ کلیسائی نظام جو درحقیقت ایک انتہائی قسم کا آہنی سیاسی نظام تھا، لیکن اس کی جڑوں میں مذہب کے نام سے پانی پہنچایا جاتا تھا، بات بات پر خدا اور خدا کے بیٹے اور خدا کے بیٹے کے حواری پطرس کے ناموں سے

وہ سب کچھ کیا جاتا تھا جس کی نظیر شاید دنیا کے جابرہ وعمالقہ یا نمرودوں اور فرعونوں کی زندگیوں میں بھی بمشکل ہی مل سکتی ہے، مگر ان کے کسی قول و فعل پر حرف گیری کفر و ارتداد اور ابدی جہنمی ہونے کے مرادف تھا، حکومت ان پر مقدمہ نہیں چلا سکتی تھی۔

ایک طویل قصہ کے واقعات سے متاثر ہو کر ہنری چہارم نے پوپ کو اس خط کے لکھنے کی ایک دفعہ جرأت کی بجنسہ جسے گرانٹ نے نقل کیا ہے۔ شروع میں تھا۔

"از شاہ ہنری، جو غاصب نہیں بلکہ بفضل الٰہی حکمراں ہے، بنام ہلڈی برانڈ (نام پوپ) جو بظاہر پوپ ہے، لیکن در اصل ایک بدکردار راہب ہے۔ . . . .

گرانٹ نے آگے نقاطِ ایمائی دے کر غالباً ان بدکرداریوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا ذکر ہنری نے اپنے مکتوب میں کیا ہوگا، پوپ نے جو اس کا جواب دیا تھا اس میں پہلے تو پطرس حواری کی روح کو خطاب کر کے اپنی مظلومیت پر رویا ہے اور آخر میں تھا۔

"میں تمام مسیحیوں کو ہنری چہارم کی فرمانبرداری سے بری کرتا ہوں اور حکم دیتا ہوں کہ کوئی شخص اس کو بادشاہ تسلیم نہ کرے، چونکہ اس نے عیسائی ہو کر فرمانبرداری سے منہ موڑا ہے اور خدا سے منحرف ہوا ہے لہذا میں اسے ملعون قرار دیتا ہوں۔" (ص ۷)

آج ظاہر ہے کہ یہ بے جان الفاظ ہیں، لیکن جن دنوں پوپ سے انحراف خدا سے انحراف کے ہم معنی بنا ہوا تھا اس وقت اس کا کیا اثر پڑتا ہوگا، پھر کلیسا کے اس نظام سے پوپ اور پوپ کے ماتحت بشپوں اور پادریوں نے جس قسم کے مطلق العنانہ اقتدارات حاصل کئے تھے، ان اقتدارات سے جو نفع وہ مسلسل سرزمینِ یورپ میں تقریباً ایک ہزار سال تک اٹھاتے رہے، آج اُن سے کون ناواقف ہے "اعترافِ جرم" کی چلتی ہوئی تدبیر نے عوام کی گردنوں کو ان مذہبی نمائندوں کے فولادی پنجوں میں جس طریقے سے دبا یا تھا، کہ پادریوں کے جرائم سے کوئی واقف نہیں، لیکن ہر خونی، چور، ڈاکو، بٹ مار، اپنی زندگی کا سارا کچا چٹھا ان کے آگے اگل آتا تھا، جنت کے ان کلید برداروں نے عوام کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ حاصل کرتے ہوئے جن جن

طریقوں سے ان کو لوٹا کھسوٹا ہے، کیا ان کی تفصیل کی حاجت ہے؟ پروٹسٹنٹ فرقہ کے بانی لوتھر کے متعلق تو کہتے ہیں کہ شروع میں کلیسا کی مخالفت پر اس کو جس چیز نے آمادہ کیا وہ ان پادریوں ہی کا پرانا دستور "جنت فروشی" کا تھا۔ گرانٹ نے اس قصہ کو درج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تہتز نامی پادری، لوتھر کے زمانے میں جرمنی آیا، ایک گرجے کی تعمیر کے لئے چندہ جمع کرتا تھا، لیکن کس طریقہ سے،

"اس نے لوگوں کے سامنے معافی کے پروانوں کی فروخت شروع کی ......"

اور یہ کہ

"اگر وہ چندہ دیں گے تو اس کے معاوضہ میں خود اُن کے اعزہ واحباب دوزخ کی آگ سے محفوظ رہیں گے۔" (ص ۴۹۷)

اور یہ کوئی استثنائی مثال نہ تھی، کلیسا، جس کا نظام پورے ملک پر محیط اور حاوی تھا چپہ چپہ پر گرجوں اور خانقاہوں میں کلیسا کے ملازم پادری اور بشپ بیٹھے ہوئے اس کا انتظا[ر] کرتے رہتے تھے کہ نزع کی کیفیت کس ڈیوک یا نائٹ پر ہمارے علاقہ میں طاری ہوتی ہے، لکھا ہے کہ پادری کا اس وقت مرنے والے کے سرہانے پر موجود رہنا ضروری تھا، مرنے والے کا ادھ[ر] دم نکل رہا ہے اور پادری صاحب مراقبہ سے سر اٹھا کر سیاہ سیاہ چہروں، نیلی نیلی آتشیں آنکھوں والے فرشتوں کی آمد کی اطلاع دیتے ہیں، جو اس گناہ گار کی روح قبض کرنے کے لئے آدھمکے ہیں نجات کی راہ صرف یہ بتائی جاتی ہے کہ کلیسا کے نام کچھ وقف کیا جائے، خیرات نکالی جائے، کس ک[ا] جگر اتنا سخت ہوگا جو ایسے وقت میں بھی نہ پگھل جاتا ہوگا، علاقے کے علاقے ان تدبیروں سے کلیس[ا] کی ملک میں مسلسل منتقل ہوتے جاتے تھے، خدا کی رحمت کی باضابطہ تجارت ہوتی تھی۔

اور یہ تو اس وقت کے قصے ہیں جب تک کلیسا کے خلاف لب ہلانے، پیشانی پر بل ڈال[نے] کی ہمت کسی میں نہ تھی، لیکن سولھویں صدی کی ابتدا میں جب لوتھر کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا او[ر] [illegible] آمادہ ہوا، اس کے بعد انیسویں صدی کے قریب

قریب تک اسی غریب مذہب کے نام سے خون کی جو ندیاں کلیسا کی طرف سے بہائی گئیں، اس وقت سے جب سولہویں صدی کے آخر میں یعنی ۱۵۷۲ء میں جو قتل عام پیرس کی گلیوں میں رومن کیتھولک (یعنی کلیسا کے علمبرداروں) کی طرف سے پروٹسٹنٹ فرقہ کا کیا گیا، نو دن تک قتل کا یہ بازار گرم رہا، پچیس سے ستر ہزار تک مختلف اندازہ کرنے والوں نے مقتولین کی تعداد بتائی ہے، حاملہ عورتوں کے بچوں کو پیٹ پھاڑ کر زندہ نکالا جاتا تھا اور کتوں کے آگے ان ہی معصوم بچوں کو ڈال دیا جاتا تھا۔ دریائے سین کا پانی سرخ ہو گیا تھا، اسی کا نام "بارتھلمو کا ہنگامہ" ہے۔[1]

اور ان قصوں کو میں کہاں تک نقل کروں، کلیسا کے در و دیوار، اس کی ایک ایک اینٹ، ایک ایک پتھر جس سے اس کی تعمیر ہوئی تھی "لمن الملک الیوم" کی آواز نکل نکل کر یورپ کے گاؤں گاؤں، کھیڑے کھیڑے میں گونجتی رہتی تھی، گرانٹ صاحب نے ایک اور موقعہ پر ایک پاپائی دعویٰ ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

"خدا نے ہمیں تمام بادشاہوں اور شہنشاہوں کا سرتاج بنایا ہے، تاکہ ہم اس کے نام سے جسے چاہیں اکھاڑ پھینکیں، تباہ کر دیں"

یہ پاپائی جلال کا اظہار تھا، جو خدا کے نام سے کیا جاتا تھا، اور اس تخریبی اقتدار مطلق کے بعد تعمیری اختیار کی تعبیر ان الفاظ میں کی جاتی تھی۔

"یا اگر چاہیں تو تخم ریزی کریں، اور نئی عمارت بنائیں"

گرانٹ صاحب نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ کلیسا کا عام ادعا یہ تھا۔

"اگر دنیاوی حکومت سے غلطی ہو جائے تو روحانی حکومت اس کی اصلاح کر سکتی ہے لیکن اگر روحانی حکومت سے کوئی غلطی سرزد ہو تو اس کا انصاف کرنیوالا خدا ہی ہے (ص ۲۳۲)

(۱) گرانٹ ہی نے لکھا ہے کہ ان پوپوں کے پاس گذشتہ بالا وثائق اور دعاوی کے علاوہ چار چیزیں اور تھیں سینٹ پیٹر (پطرس حواری) کی عبا (۲) قسطنطین کا تاج (۳) جنت کی کنجی،

[1] تفصیلات کے لئے یورپ کی عام تاریخیں اور علامہ فرید وجدی کی کنز العلوم واللغۃ ... [illegible]

(۴) صلیب، کسی قسم کا کوئی شخص ہو، ان چیزوں کے پہن لینے کے بعد وہ دنیا کی تمام قوتوں کی دسترس سے باہر ہو جاتا تھا ایک پوپ جس کا نام "بانی فیس" تھا اور مشہور شاعر "ڈانٹے" کا معاصر تھا اس پر بیسیوں قسم کے الزامات تھے، خود شاعر ڈانٹے بھی اس کے شدید مخالفوں میں تھا لیکن مخالفوں کے محاصرہ میں اپنے آپ کو پاکر اس نے بقول گرانٹ،

"سینٹ پیٹر کی عبا زیب بدن کی، قسطنطین کا تاج سر پر رکھا، اور بہشت کی کنجیاں اور صلیب اپنے ہاتھ میں لیکر تختِ پاپائی پر جلوہ افروز ہوا" (ص ۳۳۷)

لیکن اس پر بھی بعض مخالفوں نے سخت و سست سنایا، بلکہ کہتے ہیں کہ اس بڈھے پوپ کے منہ پر زرہ پوش کولونا نے گھونسہ بھی مارا، حالانکہ وہ اپنے منصب کا پورا لباس پہنے ہوئے تھا۔ گرانٹ کا بیان ہے کہ یہ ایسا واقعہ تھا کہ

"ابنائے زمانہ کو اس (مجرم پوپ) سے ہمدردی پیدا ہو گئی، وہ ان قصوں اور روایتوں کو بھول گئے جو اس کے افعال و خصائل کے متعلق مشہور تھیں، حتی کہ شاعر دانتے جو اس کا مخالف تھا مگر اس نے بھی ایک عظیم الشان نظم میں اس اندوہناک واقعہ کا ذکر نہایت تاسف سے کیا ہے، اس کا قول ہے "مسیح پھر حواریوں کے درمیان مصلوب کیا گیا، سرکہ اور زہر اس کے لبوں سے پھر لگایا گیا" (ص ۳۲۷)

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ پوپ تو خیر پوپ ہی تھے ان کے اعمال و افعال، خصائل و عادات کی تفصیلات تو کتابوں میں پڑھیئے، کلیسا کے دائرہ میں جو لوگ راہب بن کر زندگی گذارتے تھے، گرانٹ نے ان کی اخلاقی خرابیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"بعض راہب تو پورے پورے ڈاکو بن گئے" (ص ۲۳۰)

اور یہ تو ابتدا میں ہوا، بعد کو دین اور دین کی نصرت و تائید کے نام سے صدیوں تک مذہبی اختلافات کے اس قصہ میں جو کچھ کیا گیا ہے "محکمہ تفتیش" نے جو فرائض انجام دیئے ہیں، ایک فرقہ نے دوسرے فرقہ والوں کو موقع پانے کے بعد جن جن ہوش ربا، روح فرسا تدبیروں سے قتل

کیا ہے یا زندہ جلایا ہے اور مختلف ترکیبوں سے مارا ہے، حساب لگانے والے کہتے ہیں کہ ان کی تعداد دس لاکھ تک پہنچی ہوئی تھی۔ اور میں کہاں تک تفصیل کروں کہ اس راہ میں کیا کیا نہ کیا گیا۔ مذہب اور مذہبی نمائندوں کے متعلق کیا بتایا جائے کہ غریب یورپ کو کن کن تجربات سے گذرنا پڑا ہے ہم سُن رہے ہیں اور ہمارا خون کھول رہا ہے صرف اِس لئے کھول رہا ہے کہ کچھ بھی ہو، آخر وہ بیچارے بھی تو انسان ہی تھے، لیکن یورپ کو تو بھگتنا پڑا ہے، سال دو سال نہیں، صدی دو صدی بھی نہیں ہزار ڈیڑھ ہزار سال تک یورپ کے مذہب نے ان ہی آتشیں تماشوں کو اس کے آگے مسلسل پیش کیا ہے اور یہ ہے یورپ کے مذہب اور مذہبی اختلافات کے ماضی کی تاریخ جس کا نام اس نے "قرونِ متوسط" رکھا ہے۔

جنھوں نے نہیں سوچا ہے، اگر واقعی حقائق و واقعات کی روشنی میں وہ کچھ سوچنا چاہتے ہیں، خدارا اب تو انھیں سوچنا چاہیئے کہ اسلام کے مذہبی اختلاف کی تاریخ کو یورپ کے مذہبی اختلافات کی تاریخ پر منطبق کر کر کے آئے دن جن نت نئے نتائج سے سیدھے سادے ناواقف مسلمانوں میں وہ حیرانی و تشویش پیدا کر رہے ہیں، دین کی نہ سہی علم ہی کی کیا کوئی سچی راستبازانہ خدمت انجام دے رہے ہیں؟

یہ صحیح ہے کہ ان نتائج کے پیدا کرنے میں ان مخفی کنایوں اور معصومانہ اشاروں کو بھی گونہ دخل ہے، جن کا ذکر اسلامی تاریخ کے متعلق یورپ کے مورخین کسی نہ کسی وجہ سے ایک حد تک اپنا خوش گوار فرض یا لذیذ مشغلہ قرار دئے ہوئے ہیں، ان کا تو شائد التزام ہے کہ جن جن آلائشوں سے ان کی تاریخ کا دامن ملوث اور آلودہ ہے واقعہ ہو یا نہ ہو، لیکن کسی نہ کسی طرح ان ہی داغوں اور ان ہی دھبوں کو اسلام کے دامن پر بھی نمایاں کر کے دکھا دیا جائے۔

غیر مذہب والوں کو بہ جبر عیسائی بنانا، قرونِ متوسطہ کی ایک عام خصوصیت ہے خود مسلمانوں کے ساتھ بلکہ ازابیلا اور اس کے شوہر فرڈی نینڈ نے اسپین میں جو سلوک کیا آج اس سے کون ناواقف ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ جس ملک میں مسلمانوں کی حکومت چھ سو سال تک رہی

آج وہاں اسلام کا نام لیوا بھی کوئی نہیں ہے۔ سسلی ہو یا مالٹا یا وہ سارے جزائر جو مسلمانوں سے چھینے گئے۔ تقریباً سب کا یہی حال ہے۔ گرانٹ صاحب جنھیں اپنے آبا و اجداد کی عیب پوشیوں میں کچھ کم مہارت حاصل نہیں۔ ایک موقعہ پر جرمنی کی ایک قوم فرینک نامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"انھوں نے نہایت سختی کے ساتھ وہاں کے باشندوں کو عیسائی ہونے پر مجبور کیا۔"

اسی پر اور اضافہ کرتے ہیں۔

"شارلی میں (جو ہسپانیہ کے مسلمانوں کا حریف مقابل تھا) بھی اپنے شکست خوردہ حریف کو ہمیشہ عیسائی ہونے پر مجبور کیا کرتا تھا، بغیر اس کے ان کے اظہار اطاعت کو قبول نہ کرتا" (ص ۳۵۱)

لیکن پھیلا دیا گیا کہ اسلام ہی دنیا میں بہ جبر پھیلا، حالانکہ مشکل ہی سے اس کا کوئی ایسا ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے جو قابل تسلیم ہو۔

مخالف قوموں پر فتح پانے کے بعد قرونِ متوسطہ کے عیسائیوں کا عام دستور تھا کہ ان کے کتابخانوں کو جلا دیتے تھے، عبادت گاہوں کو ڈھا دیتے تھے۔ گرانٹ صاحب نے ایک موقعہ پر لکھا ہے حالانکہ اس قسم کے واقعات کے تذکرہ کرنے میں وہ بہت زیادہ محتاط ہیں۔ تاہم لکھتے ہیں۔

"مسیحیت کی فتح کے ساتھ ہی افسوس ہے کہ فنون لطیفہ کے نادر نمونوں کو اس بے دردی سے تباہ کیا گیا کہ صفحاتِ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"شعراء و فلسفیوں اور مورخوں کی ان تصانیف کے ساتھ بھی یہی برتاؤ روا رکھا گیا۔" (ص ۲۱۰)

اور یورپ کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن ہم نے جو کچھ کیا ہے، تم بھی اسی جرم کے مجرم ہو، صرف اس کو دکھانے کے لئے کون نہیں جانتا کہ سکندریہ کے کتب خانہ کا لطیفہ تراشا گیا، جو بات نہ عقلاً درست ہو سکتی تھی اور نہ نقلاً، کوشش کی گئی کہ اسی کو صحیح اور درست

ثابت کر کے دکھایا جائے، خیر یہ تو چند خارج از بحث مثالیں تھیں، قصہ مذہبی اختلافات اور ان کے نتائج کا ہو رہا تھا، یورپ کی پوری تاریخ چونکہ ان ہی ہنگاموں کا ایک خونیں مرقع ہے کلیسا اور کلیسا کے وابستوں نے جو کچھ کیا، یہ تو پچھلے زمانہ کی تازہ تاریخ ہے، مشکل سے ان واقعات پر صدی دو صدی سے زیادہ مدت گذری ہے لیکن سچ پوچھئے تو عیسائیوں کا یہ حال ابتدا ہی سے تھا، سنہ ۳۶۰ء کے واقعات کے سلسلہ میں گرانٹ صاحب نے لکھا ہے،

"مختلف مسیحی فرقے اس وحشیانہ پن کے ساتھ آپس میں لڑ رہے تھے، کہ صوبہ افریقہ کا ایک بڑا حصہ ویران ہو گیا" (ص ۲۰۶)

بہر حال ہو سکتا ہے کہ اسلام کے مذہبی اختلافات کی تاریخ سے آج جن نتائج کے پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، ان میں مغربی مورخین کے اس طرز عمل کو بھی دخل ہو کہ جو تیر ان کے کلیجوں میں چبھے ہوئے ہیں، ان ہی کو نکال نکال کر حسب عادت وہ اسلام کے سینے میں بھونکنا چاہتے ہوں لیکن ان سے ہماری شکایت بے جا ہے، مجھے تو گلہ اپنوں سے ہے، ان سے پوچھتا ہوں کہ اپنے حال کو سمجھنے کے لئے بجائے اپنی آنکھوں کے غیروں سے مانگی ہوئی آنکھوں سے مطالعہ کرنا کہاں تک درست تھا، جن لوگوں کو اب تک اس کی توفیق نہیں ہوئی ہے، کاش میرے پیش کردہ بیانات ہی کے بعد ان میں خود تصوریت کے جذبہ غیرت میں کچھ جنبش پیدا ہو۔

خیر کچھ بھی ہو اب بتایا جائے کہ مذہب کے لباس میں یورپ نے اپنے قرونِ متوسطہ میں جو کچھ دیکھا، اور جو کچھ مذہبی نمایندوں کی طرف سے اس کو دکھایا گیا ہے مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ کے کسی حصہ میں اسے ڈھونڈھا جائے، غریب مسلمانوں نے کب اور کہاں کلیسا کا نظام قائم کیا، پاپائیت مطلقہ کا مقام عام مسلمانوں کے مقابلہ میں یا ان کے سلاطین و امرا کے مقابلہ میں کن کن لوگوں کو کس کس قرن میں کہاں کہاں حاصل ہوا تھا، نہ جاننے والوں کو جاننے کی قدرتی ضرورت نے عام مسلمانوں کو مختلف زمانوں میں جن جن جاننے والے بزرگوں پر جمع کر دیا تھا۔ جہل کا علم کے ساتھ جو یہ ناگزیر فطری تعلق ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں جو مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں بھی مسیحیوں کے

قرونِ متوسطہ کی تصویروں کو نمایاں کرنے کے لئے بے چین و مضطرب ہیں ان ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ احتیاج کے اس تعلق سے نفع اٹھاتے ہوئے کب، کہاں، کس زمانے میں، کن لوگوں کی طرف سے ان دعووں کی منادی کی گئی کہ سب کچھ ان ہی کا ہے جو مذہب کے جاننے والے ہیں، نہ جاننے والوں کا کام صرف اس قدر ہے کہ جاننے والوں کی طرف سے جو کچھ جس شکل میں بھی انھیں عنایت کیا جائے صبر و شکر کے ساتھ اسے قبول کرلیں، صاف لفظوں میں دریافت کرتا ہوں بتانے والے خدارا بتائیں کہ مسلمانوں کے کن اماموں، کن مجتہدوں، کن فقیہوں، کن محدثوں، کن متکلموں کی طرف سے ایسا وثیقہ پیش کیا گیا، کہ

"اسلامی ممالک پر حکمرانی کا حق صرف ان ہی کو حاصل ہے"

مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں نے کس خلیفہ یا بادشاہ کے عطیہ کو دنیا میں اس نام سے پیش کیا کہ جس کا مالک تھا، اس نے اپنی شفایابی کے شکرانے میں تمام شاہی محلات، شاہی دارالسلطنت پر تمام صوبوں اور اضلاع و ممالک کے ساتھ قبضہ دلایا ہے، کس کی طرف سے اس دعوی کا اشتہار کیا گیا کہ مذہب کی نمائندگی کا جن کو حق ہے، ان پر کوئی حرف گیری نہیں کرسکتا، سلطنت کی عدالتوں کو ان کے مقدمات کی سننے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، دنیا کے سلاطین اور شاہزادے ان کے دستِ نگر ہیں، وہ جس بادشاہ یا بادشاہوں کے بادشاہ شہنشاہ کو بھی جب چاہیں معزول کرسکتے ہیں، ان بیچاروں میں ایسا کون تھا جس نے شاہنشاہوں کی سرتاجی کا دعوی کرکے اعلان کیا ہو کہ خدا کے نام سے جسے چاہیں اکھاڑ پھینکیں، تباہ کردیں، برباد کردیں نیست و نابود کردیں، منتشر کردیں، ہاتھ میں جنت کی کنجیوں کو لے کر معافی اور امرزش کے پروانوں کی ان میں کس نے کب اور کہاں تجارت کی ہے، خدا کی رحمت کا سوداگران میں کون تھا، کس قرن اور کس عہد میں یہ باور کرایا گیا کہ دنیا کی حکومتوں سے غلطی ہوجائے تو روحانی حکومت اس کی اصلاح کرسکتی ہے، لیکن روحانی حکومت سے اگر غلطی ہوجائے تو اس کا انصاف کرنے والا صرف خدا ہے۔

باوجود عیسائی ہونے کے، کلیسا کے پوپوں نے جو مذہب کی تشریح کی تھی، اس تشریح سے اختلاف کرنے والوں پر عیسائی مذہب کے پیشواؤں نے انتقام کی جو آگ، مذہب کے نام سے برسائی، دین کے نمائندوں نے قتلِ عام کے خونیں سمندر میں انھیں جو غوطے دیئے جس کے سننے سے اب بھی سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کیا مذہب اسلام کی تشریح کرنے والوں کی تاریخ میں اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ اس طرزِ عمل کو کسی پیمانے پر بھی، کبھی روا رکھا گیا ہے، دینی اختلافات کے متعلق عام مسلمانوں کا جو نقطۂ نظر ابتدا سے آخر تک رہا، اس کا حال سنایا جا چکا ہے، کیا دونوں میں کوئی نسبت ہے؟

کلیسا کے تشریحی نظریات و آرا سے اختلاف کرنے والوں کی تفصیل سے یورپ کی تاریخ بھری پڑی ہے، اجمالاً میں نے بھی اشارے کئے ہیں، لیکن "مذہبی اختلاف" کے جس لفظ نے یورپ کی سرزمین کو سینکڑوں سال تک انسانوں کے خون سے رنگین رکھا، بجنسہٖ اسی "مذہبی اختلاف" کی جو تاریخ اسلام میں مرتب ہوئی ہے، سنتے ہو اس کے واقعات کیا ہیں، خود امام مالکؒ راوی ہیں۔

قال لما حج المنصور قال لی	جب عباسی خلیفہ منصور نے حج کیا تو اس نے
عزمت علی ان امر بکتبك	مجھ سے (یعنی امام مالکؒ سے) کہا میں نے یہ پختہ ارادہ
هذا التی وضعته فتنسخ ثم	کر لیا ہے کہ جو کتابیں آپ نے لکھی ہیں ان کی نقلیں کرا کر
ابعث الی کل مصر من امصار	پھر مسلمانوں کے ہر ہر شہر میں انھیں بھیج کر یہ فرمان
المسلمین منها نسخة و	کر دوں کہ لوگ صرف ان ہی کتابوں کے مطابق
آمرهم ان یعملوا بما فیها	عمل کریں، ان کے حدود سے متجاوز ہو کر کوئی اور
ولا یعتدوه الی غیره۔[1]	طریقہ نہ اختیار کریں۔

---

[1] میزان الکبریٰ الشعرانی وغیرہ۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو خود تو کیا خیال آتا، ان سے اختلاف رکھنے والوں کے متعلق اس وشاہ میں خیال پیدا ہوتا ہے، اور پیدا کیا ہوتا ہے، پختہ ارادے کی شکل اختیار کر چکا ہے جو اپنی عسکری ور سیاسی قوت میں غالباً روئے زمین پر اس زمانہ کا سب سے بڑا طاقتور بادشاہ تھا، اپنی سلطنت کے سارے وسائل و ذرائع کو امام مالکؒ کے قدموں پر اس لئے ڈال دیتا ہے کہ جو ان سے اختلاف رکھتے یں، ان کا ہمیشہ ہمیش کے لئے خاتمہ کر دیا جائے اور جس تلوار کو منصور امام کے ہاتھ میں دے رہا تھا، اگر ے لیتے تو کامیابی میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی، لیکن مذہبی اختلاف کے جس تماشے کو یورپ کے رون متوسطہ اور مسیحی مذہب کے دورِ کلیسائیت میں دیکھا جا چکا ہے، اب اسی اختلاف کے نتائج و اسلام کی تاریخ میں بھی چاہیے کہ سنا جائے اور بگوشِ عبرت سنا جائے۔ خلیفہ منصور کے اس ارادے ے مطلع ہونے کے بعد امام نے جو جواب دیا وہ یہ تھا۔

یا امیر المومنین لا تفعل ھذا	اے مسلمانوں کے امیر آپ ہرگز ایسا نہ کیجئے،

یوں نہ کیجئے، خود ہی اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فان الناس قد سبقت الیھم	مسلمانوں کے پاس (دوسرے علما کے) اقوال پہلے پہنچ
اقاویل وسمعوا احادیث وروا	چکے ہیں، حدیثیں وہ سن چکے ہیں، روائتیں روایت
روایات واخذ کل قوم بما سبق	کر چکے ہیں، لوگوں کے پاس جو بات پہلے پہنچ چکی ہے
الیھم ودانوا فدع الناس	اسی پر وہ عمل پیرا ہو چکے ہیں، پس ہر آبادی کے باشندے
وما اختار اھل کل بلد منھم	جو باتیں اپنے لئے اختیار کر چکے ہیں ان ہی کے ساتھ
لانفسھم	لوگوں کو چھوڑ دیجئے۔

جو اختلاف کرے گا، اکھاڑ پھینکا جائے گا، برباد کر دیا جائے گا، نیست و نابود کر دیا جائیگا ور جنھوں نے اختلاف کیا وہ اکھاڑ پھینکے گئے، برباد کیے گئے، نیست و نابود کیے گئے،" مذہبی اختلافات سے تحفظ کے یہ نتائج یورپ کے قرون متوسطہ میں پیدا کیے، اور آپ قرون متوسطہ مسلمانوں کے جن قرون کو قرار دینا چاہتے ہیں اسی مذہبی اختلاف کے رکھنے والوں کو جب برباد کرنے

اکھاڑ پھینکنے، نیست و نابود کرنے کا ارادہ اور پختہ ارادہ کیا گیا، تو جس سے اختلاف کی وجہ سے یہ ارادہ کیا گیا تھا، اسی نے نہ صرف اختلاف کرنے والوں کو بلکہ ان کے اختلاف کو بھی نیست و نابود ہونے سے بچالیا، اور ہمیشہ کے لئے بچالیا۔ کہتے ہیں کہ کچھ دنوں کے بعد منصور کے بعد عباسی حکومت کا جو تیسرا خلیفہ ہارون الرشید تھا وہ بھی حج کے سلسلہ میں مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ پہنچتا ہے۔ امام مالکؒ سے اس کی بھی ملاقات ہوتی ہے۔ امام ہی اس قصہ کے بھی راوی ہیں۔

شاورنی هارون الرشید	ہارون الرشید نے مجھ سے اس باب میں مشورہ کیا کہ
فی ان یعلق الموطأ فی	خانہ کعبہ میں الموطأ (امام مالکؒ کی کتاب) لٹکا دیجائے
الکعبہ ویعمل الناس	اور عام مسلمانوں کو اسی کے متعلق عمل کرنے پر
علیٰ مافیہ	آمادہ کیا جائے۔

جواب میں اس وقت بھی امام نے یہی فرمایا۔

لاتفعل فان اصحاب رسول اللہ	ایسا نہ کیجئے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
صلی اللہ علیہ وسلم اختلفوا فی	صحابہ اسلام کے فروعی مسائل (یعنی البینات میں
الفروع وتفرقوا فی البلدان و	نہیں) باہم اختلاف رکھتے تھے، وہی لوگ مختلف
کل مصیب [1]	آبادیوں میں پھیل گئے، ان میں ہر ایک حق و صواب پر تھا۔

مطلب وہی تھا کہ اختلاف کی یہ شکل اسلام میں کوئی نئی چیز نہیں ہے، نبوت کے صحبت یافتوں نے جب اس کے ازالہ کی کوشش نہیں کی، بلکہ زیادہ تر یہ اختلافات ان ہی کے اختلافات پر مبنی ہیں، تو جس نے جو طریقہ اختیار کر لیا ہے، اس سے خواہ مخواہ ہٹانے کی ضرورت کیا ہے۔

"کلیسائیت" کا شبہ اگر کچھ ہو سکتا تھا تو ہماری فقہ کے ان ہی مکاتب خیال کے متعلق ہو سکتا تھا، لیکن امام مالکؒ ان ہی فقہی طریقوں میں سے ایک طریقہ کے امام الائمہ ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ اقتدار و اختیار کے باوجود مذہبی اختلاف کے ان الفاظ کو انھوں نے کتنا سبک اور نرم فرما دیا تھا۔

---

[1] میزان الکبریٰ وغیرہ۔

اور کچھ وہی اس معاملہ میں منفرد نہ تھے، کچھ پہلے عمر بن عبد العزیز خلیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مختلف اقوال میں سے اسی مذہبی اختلاف کے متعلق یہ الفاظ نقل کر چکا ہوں، یعنی ان سے جب یہ خواہش کی گئی کہ مسلمانوں کو ایک ہی مسلک پر کاش آپ بزور حکومت جمع فرما دیتے تو آپ نے جواب میں یہ کہتے ہوئے کہ "مسلمانوں میں اگر یہ اختلافات نہ ہوتے تو یہ بات مجھے اچھی نہ لگتی" ممالک محروسہ میں یہ فرمان جاری فرما دیا تھا۔

لیقضی کل قوم بما اجتمع — ہر جگہ کے لوگ اسی کے مطابق فیصلہ کریں

علیہ فقہاء ھم[1] — جس پر ان کے فقہا رہیں۔

پس وہ تھا مسلمانوں کے اماموں کا رویہ ان مذہبی اختلافات کے متعلق، اور یہ تھا امراء وسلاطین کا طرزِ عمل، کہتے ہیں ہارون الرشید کو مشورہ کے بعد امام مالکؒ نے جو جواب دیا تو ہارون الرشید نے سن کر کہا،

یا ابا عبد اللہ — اے ابو عبد اللہ (امام مالکؒ کی کنیت ہی) خدا نے آپ کو

وفقك اللہ[2] — نیک توفیق عطا فرمائی (جو یہ بات سمجھائی)

اور یہی میں کہتا چلا آرہا ہوں کہ ہمارے عوام ہوں یا خواص، مذہبی پیشوا ہوں یا سیاسی زعماء، اس باب میں سب کا ایک ہی خیال شروع میں بھی یہی تھا، درمیان میں بھی یہی رہا، اور آخر میں بھی یہی رہا لیکن نہ جاننے والوں کو کیا کہا جائے کہاں تک سنایا جائے، حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کتابوں میں جو یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ

ترك القنوت لما زار قبر — جب امام ابو حنیفہؒ کے مزار کی زیارت کو تشریف لے

ابی حنیفة وادی صلوۃ الصبح عندہ — گئے تو انھوں نے (امام شافعیؒ نے) صبح کی نماز میں

وقال کیف اقنت بحضرة الامام — قنوت کی دعا چھوڑ دی، اور بولے کہ امام کے سامنے

وھو لا یقول بہ[3] — کیسے پڑھوں وہ اس کے قائل نہ تھے۔

---

[1] دارمی ص ۹۰ ۔ [2] میزان ۔ [3] میزان ص ۱۸

بعض کتابوں میں یہ بھی ہے کہ خود امام شافعیؒ فرماتے تھے۔

صلیت الصبح فلم اجھر بالبسملۃ — میں نے صبح کی نماز پڑھی تو بسم اللہ کو زور سے نہ پڑھا

ولا قنت حیاء من ابی حنیفۃ[1] — اور قنوت کی دعا امام ابو حنیفہؒ کے شرم سے نہ پڑھی،

تقریباً اسی قسم کی بات حنبلیوں کے امام حضرت امام احمد بن حنبلؒ سے بھی منقول ہے ان سے پوچھا گیا کہ وضو کے بعد جس کی نکسیر پھوٹی ہو یا اس نے حجامت (پچھنا) لیا ہو، کیا اس کے پیچھے نماز آپ پڑھ سکتے ہیں، باوجودیکہ امام احمدؒ کا مذہب تھا کہ ان چیزوں سے یعنی خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن صحابہ و تابعین میں ایک جماعت اس کی قائل نہ تھی، جن میں سعید بن المسیب مدینہ کے افضل تابعین بھی ہیں۔ امام احمد نے جواب میں فرمایا۔

کیف لا اصلی خلف سعید بن المسیب — سعید بن المسیب کے پیچھے میں نماز کیسے نہ پڑھوں گا۔

دیکھ رہے ہو خود براہِ راست اسلام کے فقہی مکاتب خیال کے ان ائمہ کا ذاتی خیال اختلافاتِ مذہب کی ان شکلوں کے متعلق کیا ہے، حنفیوں کے مشہور امام یعنی "الامام الثانی" قاضی ابو یوسف کے متعلق ہدایہ وغیرہ تک میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ عید کی نماز میں ہارون الرشید کے منشار کے مطابق انھوں نے اپنے استاذ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کو چھوڑ کر اس فتوی پر عمل کیا جو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف منسوب ہے، بلکہ کتابوں میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ ہارون کے ساتھ قاضی ابو یوسفؒ مدینہ میں ساتھ تھے، اس زمانہ کے دستور کے مطابق ہارون ہی کو امامت کے لئے آگے بڑھایا گیا، وضو کرنے کے بعد اس نے حجامت (پچھنے) کا عمل اپنے اوپر کرایا تھا جس میں خون نکلا تھا، حنفی مذہب کی رو سے وضو ٹوٹ گیا۔ لیکن امام مالکؒ نے جو خون نکلنے سے وضو ٹوٹنے کے قائل نہیں ہیں، اسی حال میں ہارون کو نماز پڑھانے کا فتوی دیا۔ قاضی ابو یوسفؒ بغیر کسی تذبذب کے ہاتھ باندھ کر پیچھے کھڑے ہو گئے فصلی خلفہ ولم یعد (ابو یوسفؒ نے ہارون کے پیچھے نماز پڑھی اور اسے نہیں لوٹایا)[3]

---

[1] جواہر مضیئہ ج ۲ ص ۴۲۳ [2] فتاوی ابن تیمیہ ج ۲ ص ۳۸ [3] ایضاً

اور میں تو کہتا ہوں کہ خود امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ راشدین قاضی ابو یوسف و محمد بن حسن الشیبانی وغیرہم حضرات میں فقہ کے تقریباً ہر باب میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں، اگرچہ عوام میں مشہور کر دیا گیا ہے کہ ان اختلافات کی نوعیت اصولی اختلافات کی ہے، لیکن میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اصولی اختلاف یعنی دین کے "البینات" میں بحمداللہ ان بزرگوں میں قطعاً کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے، اختلافات جو کچھ بھی ہیں وہ مذہب کے صرف غیر بنیادی حصہ سے متعلق ہیں، پھر یہ کہنا کہ دوسرے ائمہ اور امام ابو حنیفہؒ میں تو اصولی اختلافات ہیں، صحیح نہیں ہے، اور اگر اصولی اختلافات کا کچھ اور مطلب ہے تو کسی حیثیت سے بھی سوچا جائے، میں قطعاً اس فرق کے سمجھنے سے عاری ہوں، جس قسم کے اختلافات امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ و مالکؒ میں نظر آتے ہیں، بجنسہ اسی نوعیت کے اختلافات امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ میں بھی تقریباً شریعت کے ہر باب میں پائے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک اس تاتاری عالم علامہ ہارون شہاب الدین المرجانی کی یہ تنقید جو قول مشہور پر انھوں نے کی ہے بالکل صحیح ہے۔ اور واقعات کے مطابق ہے، ان کی کتاب "ناظورۃ الحق" سے مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے "النافع الکبیر" میں نقل فرمایا ہے۔

لیت شعری ما معنی قولهم ان ابا یوسف ومحمد وزفر وان خالفوا ابا حنیفة فی بعض الاحکام لکنهم یقلدونهم فی الاصول ما الذی یریدون به۔	کچھ سمجھ میں نہیں آتا، لوگوں کا اس سے کیا مطلب ہے کہ ابو یوسف و محمد و زفر نے بھی اگرچہ امام سے بعض احکام میں اختلاف کیا ہے لیکن یہ لوگ امام ابو حنیفہؒ کی اصول میں تقلید کرتے ہیں۔

پھر خود ہی مرجانی نے بڑے بسط و تفصیل سے مختلف شواہد و نظائر کی روشنی میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ اختلاف کی ان دونوں قسموں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے اسی لئے ان کا خیال ہے کہ امام شافعیؒ و مالکؒ وغیرہم حضرات کو جس طرح امام ابو حنیفہؒ کے مقابلہ میں مجتہد مطلق سمجھا

جاتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ ابو یوسف و محمد وغیرہما کو بھی اجتہادِ مطلق کے اس منصب سے اتار کر مجتہد مقلد ٹھیرایا جائے۔ آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ یہ لوگ چونکہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد تھے اس لئے اپنے آپ کو تلمذاً امام ابوحنیفہؒ ہی کی طرف منسوب کرتے رہے، اسی لئے کسی مستقل مکتبِ خیال کی حیثیت سے ان کے نظریات و مجتہدات نے شہرت حاصل نہیں کی، ورنہ بقول ان کے

لو انهم اولعوا بنشر آرائهم بين الخلق لكان لكل ذالك مذهباً منفرداً عن مذهب ابي حنيفة (النافع الكبير ص ۱۵)

اگر یہ لوگ (تلامذہ امام) بھی عام لوگوں میں اپنے آرا کی اشاعت کی طرف متوجہ ہوجاتے تو ان کا بھی ایک مستقل مذہب ابوحنیفہؒ کے مکتبِ خیال سے جدا ہوجاتا۔

بہر حال جب یہی واقعہ ہے، اور اسی کے ساتھ ہم یہ بھی جانتے ہیں جیسا کہ آئندہ تفصیل سے معلوم ہوگا کہ حنفی فقہ کی تدوین، ماہرین کی ایک باضابطہ "مجلسِ شوریٰ" نے کی ہے، جس میں گویا صدر کی حیثیت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، اور ان کے تلامذہ جو مختلف علوم و فنون کے مستند ماہرین میں تھے، ان کی حیثیت ارکان کی تھی۔ سب جانتے ہیں کہ کتابوں میں امام کی رائے کے ساتھ ساتھ ان کے تلامذہ کے اختلافی آرار جو نقل کئے جاتے ہیں، یہ وہی اختلافات ہیں، جن کے اظہار کی آزادی اس مجلس میں ہر رکن کو حاصل تھی۔ صدر کی رائے کے ساتھ "متفق" ہونے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا تھا، اسی لئے جن امور میں امام سے ان کے شاگردوں کو اختلاف باقی رہتا تھا، وہ مجلس کی "یادداشت" میں اختلافی نوٹ کی حیثیت سے التزاماً درج کیا جاتا تھا، آئندہ معلوم ہوگا کہ شوریٰ کی اس مجلس میں بحث و تمحیص، سوال و جواب اعتراض و تنقید کی کتنی آزادی ہر ایک کو حاصل تھی، اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مذہبی مسائل کے ان اختلافات کی نوعیت امام اور ان کے شاگردوں کی نگاہوں میں کیا تھی؟ اپنی رائے سے اختلاف رکھنے والوں کو اگر یہ لوگ العیاذ باللہ دین کے دائرہ سے انحراف کرنے والوں میں شمار کرتے تھے، تو ان تعلقات کا باہم ان میں باقی رہنا کیا ممکن تھا۔ اور آج ہزار و بارہ سو سال سے بغیر کسی دغدغہ کے اور

شک وشبہ کے حنفی فقہ کی کتابوں میں اختلافات کے یہ سارے قصے جو نقل ہوتے چلے آرہے ہیں
یا یہ خود دلیل نہیں ہے کہ "مذہبی اختلافات" کی جو نوعیت یورپ کے قرونِ متوسطہ میں کلیسا اور
وابستگانِ کلیسا کے نزدیک یا ان کے مخالفوں کے نزدیک تھی، اس میں اور مسلمانوں کے مذہبی
اختلافات میں کسی قسم کی کوئی مشابہت یا کسی قسم کی کوئی مجانست نہیں ہے۔

مگر کیا کیجئے اور ان لوگوں سے کیا کہئے جن کے آگے مذہبی اختلافات کے الفاظ کا ذکر
چھڑا نہیں کہ اچانک یورپ کے قرونِ متوسطہ کی وہی مذہبی تاریخ ان کے سامنے آجاتی ہے۔ جس
میں بڑے بڑے اہم اختلافات ہی نہیں، بلکہ جیسا کہ گرانٹ صاحب نے لکھا ہے، ایسی چھوٹی چھوٹی
باتیں، بڑے معرکۃ الآرا مسائل کی حیثیت رکھتے تھے مثلاً

"عشاء ربانی میں خمیری روٹی استعمال کی جائے یا بلا خمیر کی، روح القدس باپ کا
مظہر ہے، یا باپ اور بیٹے دونوں کا۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ روما کے اسقف
کو تمام کلیسا پر تفوق حاصل ہے یا نہیں" (تاریخ یورپ ص ۴۱۶)

اور یہ تھے یورپ کے قرونِ متوسطہ کے وہ مذہبی مسائل جن سے عیسائیوں کی ایک ٹولی کا دین
دوسری ٹولی کے دین سے جدا اور قطعاً جدا ہو جاتا تھا، اتنا جدا کہ ان ہی اختلافات کے شعلوں میں
صدیوں یورپ کے سارے ممالک جلتے رہے، بھنتے رہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو آج بھی یورپ میں جو کچھ
ہو رہا ہے، شعور کسی کو اس کا ہو یا نہ ہو، لیکن انسانی نفسیات اور ان کے عمل و ردعمل کے قوانین
سے جو واقف ہیں، اگر وہ غور کریں گے تو اس کے پیچھے بہت پیچھے ان ہی کی چنگاریاں چھپی
دبی نظر آئیں گی۔

(باقی آئندہ)